

تماری آواز میں ایسی سختی تھی کہ یا شیشہ کٹ رہا ہو۔

”ندہ پر دلک سے کسی تو والیں آئے گانا ۔“

”اور تب لمحہ چلے ہے تو بورھی ہو جائے ۔“ باریک آواز نے یکم بھاری آواز میں  
ڈوب کر کہا۔

”میری قسمت ای! آپ قسمت سے کیوں بھکرنا تھی، میں۔“

”اب میں کب تک بیٹھی رہوں گی تیرے الہ کے دستوں کے گھر منہان بن کر۔ میرا تو خیالِ تھا کہ  
اہر میں تیری طبیعتِ سنبھل جائے گی۔“ خلا جانے تو گس دن کا بدھ لے رہی ہے میں سے۔  
دو آواز توں والی ایسی خوبی کے زیج بورھی مرغی کی طرح مخوزتی اٹھ کر اندر پلی گئیں۔ میرے لئے  
اس دن تماں دینیا کے راستھے۔ میں گردن گردن فاٹلہ فی محنت میں ڈوب چکا تھا۔ اس گفتگو نے جھوپڑا یوں  
ہا سا اٹھ کی۔ بڑی مختل سے میں فاٹلہ کے پینگ تک پہنچا۔ حسب معمول اس کے پینگ پر سفید چادڑ پھی  
تھی۔ ایک کمزور قسم کا بلب لیٹریں دلے دروازے کے اوپر تا آجھی کے سفید شید میں جعل رہا تھا۔ فاٹلہ کے  
رنگے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر ایک تھوس ایک گھاٹی اور پنڈ دوایاں پڑی تھیں۔ مار کر کے میں کدرو  
گوشت اور لبے چادلوں کی خوشبو تھی۔

”فاٹلہ!“ میں اکٹھی آنام کرسی پر بیٹھ گیا۔

پہلی مرتبہ بڑی خوشی سے اس نے میرا استقبال کیا۔

”تم قین دلک سے کہاں غائب تھے اقبال!“

اگر آج سے پہلے دہ ایسی دلچسپی میں یہی سوال پوچھتی تو میں غائب اجات بحق ہو جاتا۔

”میں تھا۔“

”تمارے ہاتھی پیٹھے ہو گئے۔“

”ہو گئے۔“

”کون بیٹا۔“ تم یا اسلامیہ کلائج۔“

ہم — میں نے آنسو دوکر کھما۔

نائزہ — ہم تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے خدا خواستہ اس کرنے ہو — تم نے ملکا کرنا۔

کچھ ایسا ہی ہے —

مشکل کھلائی ہے — ایکشنا سے کام نہیں چلے گا حضرت!

میں نے تمہیں کبھی لیسے وہیں نہیں دیکھا تھا۔ تم دونوں کہنیاں بھی پڑھائے باقتوں کے پایے میں کنوں ساچھہ لئے بیٹھی تھیں۔ اور میں اس طوفان کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا جو بہرہ کہ پسیہ کے ساتھ تیری آنکھوں کی طرف اندھرا رہا۔ تم نے ان گنت باتیں کیں۔ شاید میں نے کچھ عابجی دینے ہوں لیکن ان کی صحت کے متعلق مجھے معلوم نہیں۔ بڑی دیر کے بعد تم نے میرا کندھا چھو کر پوچھا:

سونا ہے ہر اقبال؟ —

مکون؟ — میں؟ —

اور کیا میں؟ —

اس وقت پتہ نہیں کہاں چھن سے میرے آنسو تمارے لوٹتے ہوئے پڑ گئے۔

کیا ہوا — ؟ تم نے پوچھا۔ میں نے کچھ کہا ہے کیا؟ —

میں چپ چاپ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

سونا اقبال — میں نے کچھ کہا ہے —

آنسو تو اتر سے میرے گالوں پر اتر رہے تھے اور تیری منزل پر لمبا نے والے درخت کی چڑوں میں پریم جل پڑتا رہتا۔ فاطمہ نے مجھے کئی ادازیں دیں لیکن میں چپ چاپ سنچا اتر گیا۔ داں سے میں نے اپنی سائیکل میرے ہیوں تسلی سے نکالی اور نیو کمپس کی طرف چلا گیا۔ اس نہر کنارے اُگے ہوئے درختوں کی پہنچی میرے آنسوؤں نے اس دن لگائی تھی۔

اس کے بعد تم کو میں نے اپنی دانت میں زندگی سے نکال دیا ہیتے کوئی سند رابجع الوقت نہ رہا تھا۔

تم نے کراجی رواز ہونے سے پہلے مجھے کئی بیغانہ بھجوئے لیکن میں نے ایسے مرتبجی تیری منزل پر جانا پسند

نہ کیا۔ تمارے رحمت سے ایک گھنٹہ پہلے میں نے تمارے نام پر خدا کو کہا کہ کراچی کے ایڈریس پر پوسٹ کر دیا۔

فاطمہ!

اگر پردیس سے آئے والا نہ ٹوکرے تو ہر ضرور آتا۔ بھر میں تمہیں اپنے آنسو کی وجہ تباوں گا۔

اقبال!

اس خط میں اقرارِ محبت نہ تھا لیکن اس سحر فنِ رقص کو لکھنے کے بعد میں دُسری بار بی جیت گیا۔ ایک تو میں پہنچا میں اس دل در سے نکل گیا جب میں ایک مدت اور چلنے والے کی مجھ میں مکت نہ تھی۔ دوسرے میں نے گویا آندہ کیلئے پہنچنے والے دل پر ایک پر بھتی ڈال لی۔ میرا خیال تھا کہ اب چلے کریں بھی مینہ کئی کیوں نہ برسے میرا دل فاٹکی محبت سے غصہ نہ رہے گا۔ گویا یہ بھی سر امر میری انکی عطا ترکیبِ خوبی تھی۔ اس ایک خط نے فاطمہ کے ماتھ میں وہ چاکر پکڑا دی جسے اس نے کئی مرتبہ میری انا کی ننگی پیشہ پر پہ دی پے مارا۔ اگر میں یہ خط نہ لکھتا تو شاید فاطمہ بہت کچھ جانے کے باوجود میرے خلاف کوئی ثبوت استعمال نہ رکھتی۔

کراچی جانے کے کچھ حصے بعد فاطمہ کی شادی ہو گئی۔

میں نے سن اس کا دو دلما امریہ سے آیا ہے، انجینئر ہے، لمبا اوپنچا ہے۔ اس کے شگفتے اور پیسو سائی کے سادگی میں اور دوہی چھپی گوری فاطمہ کا من چاہا پر دیکھی ہے۔ میں نے چشم مار دش و دل مہاشاد قسم کی سیشیاں بجا رہیں۔ ایک پھوکا ساختھ فاطمہ کو بھیجا اور اپنے نئے تھے عشق تک کلھنی جمادی۔

AFTER AFFECTS  
اس کے بعد پورے پانچ سال گز رہے۔ مجھ پر فاطمہ کے مشق نے کسی قسم کے  
کے پنڈ سے، خامل کران کے کولے اور ہاتھ بہت جلد متبرک ریتتھے۔ میرا خیال تھا کہ میرے ہوئیں کہیں بھی فاطمہ کے مشق کے براثم باقی نہیں رہے۔

لیکن پتہ نہیں کیا بات تھی جب بھی شادی کا ذکر آ جانا تو میں محسوس کرتا بھی تھک کمیں اندر، میری گردن میں گستہ کا پتہ پڑا ہے۔ شادی کے معلمے میں میری برکیبی لگی ہوئی تھیں میں ہر روز کی کو ایک بار فاطمہ کے چونکے میں لگا کر دیکھتا اور پھر ان جانے میں چونکہ اور اڑکی دونوں کو دل کی کھڑکی سے باہر نکال پھینکتا۔

پورے پانچ سال بعد میری ملائکات فاطمہ کے شوہر سے ایک بڑے نیشن ایبل ہوٹل میں ہوئی۔ ٹووالی گرمیاں آچی تھیں۔ خوبصورت نیلے پانیوں والے سوٹنگ ٹینک میں سقیدنا ہمارے دلی اور نیشن ایبل پاکستانی تیر رہے تھے۔ کچھ دن جوان رڈیاں جو سوٹنگ نہ جانتی تھیں پانیوں میں کہڑے رکاتی پھر رہی تھیں۔ بیرے کو کا کولا، بیز اور وسکی چھوٹے چھوٹے طشتوں میں لگاتے اپریوں میں ٹیکٹ پسند راج ہنسوں کی طرح پھر رہتے۔

محبہ اور میرے دوست ریاضن کو اسی ہوٹل میں ٹھہر سے ہوتے ایک بنکا دوست کی کھیم کسل مخصوص کرناتھی لکھن اس وقت وہ ہوٹل میں موجودہ تھا۔ ہم کافی قبل غاری کے بعد ہیاں پہنچتے۔ اسکے تھوڑی دیر میں بنکا کی راہ دیکھنے کو دیں سوٹنگ پول کے نارے میٹھے گئے۔ شام اس ہوٹل میں منہ کلا کرنے کو پھر رہی تھی لکھن اب بھی ہواں بڑی جم کے گردی تھی۔ ہاں ہمنے والوں نے دوں میں حصہ عجیب قسم کی خلکی کا احساس پیدا کر کھا تھا۔ رڈیاں جب اور پڑھیاں پڑھو کر لمبے تا تو چسیدا کر خیل سا پانی میں اترتیں تو تھوڑی دیر کئے پانی کا نیلا کڑا ہاچکلا بھیں لہوں سے بھر جاتا۔ پھر لمبی ڈبکی کھا کر رڈیکی کا پھر نکلتا۔ نیلی نیلی آنکھیں پانی سے بیگنی ہوئی، سنہری بال اس درست کندھوں سے چھتے ہوتے ان سلفے کی دلوں کو دیکھ دیکھ کر دل میں سروائیٰ سی خندک پڑ رہی تھی۔ ہیں پتہ بھی نہ چلا کہ تم الغیثہ کب ہمارے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

ٹیکٹ شاک جلنے — ؟ ”جم نے ریاضن کے کندھے پر ہاتھ دکھ کر پوچھا۔

بالکل — تم شاؤ۔ ریاضن نے سوال کا جواب نہ تھر کیا۔

”پیغمبری بیٹھ ٹھاں — ”

اللہ کا شکر ہے

اس کے تعارف کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور فاطمہ کا شوہر، جو شکل امریکی امیر، وضع تعطیے سے اودھ کا دل پھوڑ فواب، عادات سے پنجے چھپانے والا بنا اور گفتگو سے پور نو گرافی سے لاکھوں کا وائیز آتا تھا، عین میرے سامنے آ بیٹھا۔

اس نے بیٹھنے سے پہلے نیلے پانیوں پر نظر ڈالی اور پھر تعارف سے پہلے دوڑتے لشکم پشم قسم کے جنی لیفٹے سناؤ لے۔

فرخ سے میری ملاقات ایک سلسلے وار پروگرام ثابت ہوئی۔ وہ اور میں ایک دمرے کو دیکھ کر بے ساختہ ہنسنے سکتے تھے۔ اس کے ساتھ زیادہ وقت جس کے زمانہ ان زار میں گزرتا۔ اسے جملے پڑ کر بات کو جسی دلکشی بارہ خوب آتا تھا۔ کئی بار فرخ نے مجھے گھر لے جانا چاہا لیکن ان دونوں بیٹے نے یہ تصوری بنار کھی تھی کہ جو دوستیاں گھروں کی مرحد میں داخل ہو جاتی ہیں وہ رشتہ داری کا روپ و ہماری لیتی میں اور دوستی کے رنگ میں بھنگ دالت ہوتا ہے۔

بالآخر ایک دن وہ دس بیسر خربوزوں کے ساتھ لاد کر مجھے بھی گھر لے ہی گیا۔

ایک پسی دلبی عورت جس نے میں خوری ساری بھی پہن رکھی تھی۔ پور پڑھ سے لمبی برآمدے میں پیروں کے بل بیٹھ کر گیٹ کی جانب پیش کئے ایک شخصی سمی پیچی کو بوث پہنرا ہی تھی۔ یہ پسی بار بار اسی عورت کی میٹھی لیتی اور پھر کان میں کچھ کہہ کر رہنے لگتی تھی۔

کار پور پڑھ میں کھڑی ہوئے، فرخ نے ملباساں بھایا۔ میں خوری نے پٹ کر کار کی جانب نہ دیکھا۔

فرخ نے ہمیں کراپی جانب کا دروازہ کھولا اور اندر کی جانب سر کے مجھے بتایا:

”ماں کی خدمت کو پتہ لگ گیا ہے لیکن پٹ کر دیکھ کر کبھی نہیں۔“

جب میں اور فرخ بازوؤں میں گول گول خربوزے اٹھائے میڑھیاں چڑھ کر پور پڑھ سے لمبی برآمدے میں پہنچے تو اس میں خوری عورت نے پٹ کر دیکھا۔

میں نے زیر بابت سے اہا۔ ”میرہ کتنا خاد و صتوں کے گھنیس جانا چلتے۔“

"کیوں۔؟"

"اس لئے کہ شاید جانی کو میرا آہنا ناگو اگر زرا ہو:

"نہیں نہیں۔ یہ سالی اسی طرح رہتی ہے۔ نہ سادون ہر سے نہ بھادوں پھولے  
فاطمہ نے اب بچی کو گود میں اٹھایا تھا اور بچی کا چہرہ ایک دوسرے کے سانچھے لمبی غمازی  
کر رہا تھا۔

میرا اقبال ہے — جس کا میں ذکر کیا کرتا تھا ہمیشہ!

"ان سے تو ہماری دور کی رشتہ داری بھی ہے شاید —" فاطمہ نے ڈرانگ رومن کا دروازہ  
کھولتے ہوئے کہا۔

"اچھا —!"

"آئیے —"

وہ چپ چاپ کھڑی رہی۔ اس کا چیلی جیسا ٹنگ اب ایسے ہو گیا تھا جیسے چینی کے برتن کو  
مسلسل دھوئیں میں رکھا گیا ہو۔ چہرے پر میک اپ کی یہکی سی جھلی چڑھی تھی جس کے باعث اور بھی  
ریگت سرخی اُنی نظر آرہی تھی۔

فرخ آتشان، پانیوں پر، کریمیوں پر جمال تمام جگہ مل رہی تھی، وہی میں سے خربوزے لالا کر  
رکھ رہا تھا۔

"پر جب بھی بطل لاتے ہیں اسی طرح لاتے ہیں۔" فاطمہ نے بٹے ترکھے لجئے میں کہا بیسے دہائے  
تفصیل خرچی یا کسی نوعیت کی بے رحمی تصور کر رہی ہو۔

خربوزے لانے اور دھرنے کے دو لان وہ خوب عادت ایک لطیفہ سنائے جانا تھا۔  
"یار اقبال۔ ایک مرتبہ میری طرح ایک اور شوہر لپنے دوست کوبے وقت گھر لے گیا۔ یہ وقت تھا  
حاشق کی وزٹ کا۔ اب جس وقت شوہر اپنے بیٹہ رومن میں گیا تو دیکھا کہ بیوی لیٹی ہے چاروں شلنے  
چٹ اور پاس رہ گکو گاٹھ میو جو دھبے —"

فاطمہ نے باب کاٹئے اور پیچی کاربن ٹھیک کرنے لگی۔

"شوہر واپس آکر بے مکلف دوست سے مخاطب ہوا۔ "بھائی۔ اندھ تو بیوی کا عاشق وجود

ہے۔ آؤ ہم باورچی خانے میں جا کر چلتے بنائیں۔"

دوست عجب سپتیا یا ہوا ساتھ چلا اور جب شوہر نے پانی کی کیتی شلوٹ پر رکھی تو اس نے

پوچھا — "اور وہ — وہ جو اندر ہے وہ ....."

شوہر نے دوست کے کندھ سے پرما اقتدار کر کہا: "حلا آزادے کو اپنی چلتے خود بنتے دو۔"

اب یہی لطیفہ کہیں میں شہر میں سنتا تو اور بات ہوتی لیکن اس وقت میں عجیب بالکل دین سا

محسوں کر رہا تھا۔ فاطمہ یوں کھڑی تھی جیسے اسے شدید قسم کا استکال آ رہا ہو۔ فرش کچھ دری مجھے دا طلب  
نظر ہوئے ویکھتا رہا اور ہفتار لٹا۔ پھر وہ خربوزوں کے کھیپ میں مشغول ہو گیا۔

شام کو فرش جسیں وقت نہانے کے لئے چلا گیا اور ٹھنڈے بھٹ پٹے میں کوٹلوں کی کوک مضم

پڑی۔ فاطمہ اپنا باغ مجھے دکھانے کیلئے چھتار سے درختوں تک لے گئی۔

اگر اس روز میں بیگ جاتا۔

اپنی ٹرانسفر کر لیتا۔

پھر سبھی فرش کے گھر نہ جاتا۔

اگر اس روز میں اس فاصلہ کا تعین کرن لیتا جو مجھے اپنے اور فاطمہ کے درمیان تاثیر بکھانا چاہئے تھا تو میری زندگی بالکل مختلف ہوتی۔ وہ اپنی دو لذن پکیوں کے ساتھ ساتھ کچھ قدم مجھے آگے آم کے گھنے درختوں تک پہنچ جاتی تھی۔ اس کی کمر کا درہ حصہ جو ملاؤڑ میں پچھا ہوا رہتا تھا بھی گائے کے دودھ کی مانند تھا۔ ریڑھ کی بڑی کا نیچا نیچا نیش بہ مرتبہ سارٹھی اٹھئے پر نظر آتا۔ خور دی سی ادھ کلی ایڑی جوڑے کے پنج گروں پر آئے ہوئے بھر بھرے سے بال، آدمی اسٹینڈ میں آگے چھپے جھوٹتے چوڑلیوں سے لدے ہوئے بانو۔ وہ مجھے چند قدم آگے تھی۔ اس کی پیچاں مکمل طور پر طوطیاں تھیں، دہ مسل کے آم کھائے جا رہی تھیں اور بولے جا رہی تھیں۔ بھرٹی چھوٹی بکیریوں میں چسی کچپی باتیں!

ہرچیل میں نہ جتنے عشق کئے تھے ان میں یا تو میں بالآخر بوجھ بنا۔ یا جس سے میں نے محبت کی وہ شخص میرے سینے کی سل شتابت ہوا، فاطمہ کا عشق تو کہا دون میں چیپی ہوئی بازگشت تھی جو ٹھکرائے جاتی ہے اور والپس آئے جاتی ہے جس کے تھیرے انسان کامنہ کھلے کا کھلا رہ جاتا ہے۔ یہ عشق شہنم کی دو بوند تھی جس کا کسی پتی پر کبھی بوجھ نہیں ہوتا۔

فاطمہ شادی شدہ تھی۔ وہ اگر قاتمہ ہوتی، اگر وہ کسی سمجھنگ کرنے والے گروہ سے منسلک ہوتی۔ اگر اس کے سو عاشق ہوتے۔ اگر وہ بھنگ پلاکر، چرس کا سکریٹ بیچ کر، ادا فیا کیلئے لگا کر روزی کما والی ہوتی۔ تو پھر بھی سب کچھ ٹھیک تھا۔ فاطمہ کی ہر زنا ٹھیک میرے لئے ٹھیک تھی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ دور تین بھر سے باز، زن فروش اثرا بیوں سے کیوں محبت کرتی ہیں۔ اب میں جانتا تھا کہ لوگ طوائفوں کی خاطر زہر کیوں کھایتے ہیں۔

اب مجھے پتہ چل گیا تھا کہ فاطمہ کی ہر زنا ٹھیک میرے لئے ٹھیک تھی۔  
شام میں دوپہر کی بہت کچھ گرمی باقی تھی۔ ہم اس رہت ہیں پہنچے جہاں اس وقت ہیں تو نہ بتتے تھے لیکن چر کچھ میرے شفاف پانی جمع تھا۔

"می۔ ہم نہالیں۔"

کئی بار پھیول کے اصرار اور میری سفارش کے بعد فاطمہ نے پھیوں کے ٹوٹ اور فڑاک آتا رہیے اور وہ دونوں چہنے پر میں اتر گئیں۔ چستارے درخت تک اپنے ٹھنڈے کنٹوں کی منڈر پر پہنچا کر پہلی بار فاطمہ نے میری جانب دیکھا۔

یہ لمبے بیاگ جانے کا تھا۔

یہ لمبے ہجرت کرنے کا تھا۔

آزادی کا آسمان کھانا تھا اور میرے پر کافی مضبوط تھے، لیکن — "آپ کا خط مجھے

مل گیا تھا —

"اجا — ؟"

اپ کی شادی کیوں نہیں ہوئی ابھی تک؟ —

یہ استغفار غایباً اس وقت ادا کیا وہ اپنے کا جب پہلے پہل مرداوں عورت نے شادی کی تحریم ایجاد کیا گی۔ یہ سوال لاکھوں نے سابقین سے پوچھا ہو گا لیکن میرے اندر گریا پانی کا ٹیوب دیں یکدم جل اٹھا اور جواب ان پانیوں میں چھیدوارکشی کی طرح ڈوب گیا۔

” بتلیے ہا! کیوں نہیں شادی کی آپ نے؟ —

” بس۔ کوئی رذکی نہیں تھی۔

” ایک بھی نہیں —؟

” ایک بھی نہیں —

” وجہ؟ ”

” پتا نہیں —

” کیا چاہتے ہیں آپ رذکی میں —

” مجھے اس کا سیدھا سادا جواب بھی آتا تھا لیکن اس لمحے میں اخفا اور اس کے درخت کی اوث میں جا کر کھڑا ہو گیا۔

” برسوں کے ٹھہرے ہوتے بندگا نسوجاری ہو گئے — کیا چاہتا تھا میں ایک رذکی سے؟

” مجھے یوں رنگابجیے فاطمہ کے بااغ میں ابھی مری آمد سے پہلے بخوبی ہوئی زمین تھی، یکدم وہاں

میرے آنسووں سے بڑے بڑے لگنے لگے درخت اگل آئے — ان درختوں کی ڈالیوں سے میرے آنسو

پریں اترنے لگے جیسے برسات کے بعد آدمی رات کو بارش کے قطرے پر ہوں سے پھل پھیں کر زمین پر

اترا کرتے ہیں۔ آنسوں جل سے فاطمہ کا بااغ لمباٹھا رہا۔ میرے پاس آئی اور اس نے آتے ہی اپنا گرم گرم

ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیا۔ پہنچے ہی نائکوں کی تیزی نے جسم کی حدت کو اندر سمیٹ رکھا تھا۔

” اب اس کا ہاتھ اپس کی طرح لگا۔ مجھے خیال آیا میں بھک سے اڑ جاؤں گا۔

” اب تک روئے ہیں آپ:

میں نے من پر سے کر دیا۔

”میں نے زندگی میں — آپ کے سما کسی درود کو رتے نہیں دیکھا۔“

اس کے حضور مجھے ایک سٹھن کے لئے احساس نہ ہوا کہ یہ آنسو مردا بھی کی تو، میں ہیں۔ مجھے ذرا بھی خیال نہ آیا وہ کیا سمجھے گی۔ نہ جانے کس دفت، کہیں آگے چل کر وہ ان آنسوؤں کا فائدہ ہی سا۔  
املاکے لئے۔

اس کا ما تھا بھی میرے کندھ پر تھا۔

”میں آپ کے لئے رڑکی ملاشی کروں گی..... اپنی پسند کی!“

”مزدود کیجئے — مزدود — بکھر جلدی ہو سکے تلاش کیجئے۔“

جبب ہم دونوں گھووالپیں لوٹے تو فخر سفید پینٹ قیفیں میں ٹوٹی کر لٹیں بنالان میں بیٹھا گزوہزے کھارا تھا۔ فالمہ دوپہر کو کھلنے پر، شام کی چانپے پر اور باغ کو روشن ہونے تک بالکل قطیرے گوند کی طرح ٹھنڈی تھی میں اب وہ بے تماشا خوش نظر آ رہی تھی — گویا کرنی پسلوان کھڑی مل جیت کر آ گیا ہو۔

”فرخ ان کے نئے۔ اقبال صاحب کے لئے تماری پھوپھی کی رڑکی کسی سی رہے گی؟“

”کون سی رڑکی..... نیز سے میری اصلی اور منہ بولی بارہ پھوپھیاں ہیں۔ ان کے بیٹیاں بھی

تھوک کے حساب سے بھی ہیں اللہ میاں نے۔“

”فیروزہ —“

”نہ نہ نہ —“

”بیکوں؟—“

”اس کا دہن بہت چھوٹا ہے۔“

”چھوٹا دہن تو فویں بھورتی ہے۔“

”چھوٹے دہن والیاں کچوں ہوتی ہیں۔ فرخ نے مجھے آنکھ ماری۔“

اس سے پہلے وہ مجھے چھوٹے دہن والی ایک رڑکی کا بڑا ہی تند ذہبرا جسی طفیلہ سنا چکا تھا۔  
اب ایک عجیب قسم کا سندھ شروع ہوا۔ فاطمہ نے مجھے چھتری کی طرح بغل میں واب کر جگہ جگہ  
گھانہ شروع کر دیا۔ وہ مختلف گھوڑوں میں داخل ہوتی۔ چھتری کھولتی۔ سب کو دکھاتی اور پھر خود اپنی چڑا  
میں بیٹھ کر، واب پس بغل میں واب کر والپس گھر رکھاتی۔

بولاڑکی مجھے ذرا سی پسند تھا تو فاطمہ فرش اس کا پستہ کاٹ دیتی۔ بولاڑکی مجھے دل سے ناپسند  
ہوتی فاطمہ اس کی تعریف میں کو سول کا سفر کرتی۔ ایسی دوڑ دھوپ میں وہ ہمیشہ میری کار میں میرے ساتھ  
فرشت سیٹ پر بیٹھ جاتی۔ فرزخ ہمیشہ ہمیں کوئی جنسی خیالات سن کر خدا حافظ کہتا۔ میں نے عموماً اُوٹ  
کیا کہ فاطمہ اس کے سامنے اس کے لیے پر کمی مکراتی تھی۔ بلکہ فرزخ نے مجھے علیحدگی میں کہہ دکھا  
تھا۔— یہ وہابی خیالات کی حدودت ہے۔ مجھے کہی کہی گھنے دیکھو دیتی ہے کہ میں یہ بے ہودہ کوئی  
چھوڑوں نکلنے یا رہنمایاں پیتا۔ یورپیوں کا مجھے شوق نہیں۔ جو امیں نہیں کیھلتا۔ اب میں اکھڑتا  
نہیں ملا کسکتا تو کیا ہوا۔ ایسے طفیلہ میں جو لذت ہے اس سے بھی خروج ہو جاؤں —؟

یہ لیٹنے جو ہم جانے سے پہلے سن کرتے ہو یا ہوا میں ایک بگونکم کی طرح چلتے رہتے ہو جرم ایک  
ڑکی دیکھتے اسے ناپسند کرتے اور لوٹ کتے۔  
یہ منٹلگری کے سفر کا دنکر ہے۔ اس بار فرزخ بھی ہمارے ساتھ تھا۔ ہم سول لائیں میں دہنے والے  
دو بیتل فارست آفیسر کی بیٹی کو دیکھنے کر تھے۔  
بیٹی کو دیکھ کر سب سے پہلے فرزخ دنگ ہوا۔  
پھر فاطمہ سپٹا۔

پھر میں ہر کی چک ہو گیا۔  
فارست آفیسر کی دھالنی رڑکی بڑی ہی ڈاکاٹ لئے والی تھی۔ پہلے دن تو وہ چب چب، دبیتے  
میں الگ چھپتے، پھر ٹوں میں آنکھیں پیٹتے، ہونٹوں میں دانت چھپتے اللدمیاں کی گلائے بنی بڑی  
میکن دوسرے دن جب فرزخ کھلنے کی میز پر بیٹھا ٹوٹ پر جیم سکار رکھا تھا۔ اور وہ تو قوتی ہماری جاتے

پشت کئے بھلی کشکے تو سڑ پر ڈبل روٹی کے کمروں سینک رہی تھی۔ فرخ اپنے مخصوص لطیفوں میں گن ہو گیا۔ بہت بار فاٹلہ نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ اپنے پاؤں سے اس کے جوتے کو ٹھکرا، پر فرخ جب اپنی چہرے چہرہ شروع کر دیتا تو پھر اس کے اپنے ہاتھوں میں کوئی بریکی نہ رہتی تھی۔ جتنی دیرہ لطیفہ سناتا رہا سیمک کی پشت ٹوپنے جیسے کو الوں پر ملکی نستی رہی۔ لیکن سلسلہ دار ثابت ہو رہے تھے۔ بالآخر جب فرخ کمرہ رہا تھا... . . . ایک تھا پکھ اپنی منی علگا۔ اس کی ماں تھی ہماری فاطمہ جیسی۔ اس کا شوہر گودل میں بہت قدر و ان تھاں کیں منز سے کسی اعزاز نہ کرتا تھا۔ . . .

تو اس عتیقے دافی نے منہ کھولا اور بولی: "ملے کے کاش دہ بڑا بڑا مآخواب میں۔ نہیں میں تو بڑا

ولے شوہر ساری غلط فہیماں دوڑ کر دیا کرتے ہیں:

بُشے تریک میں فرخ نے قبورہ لگایا۔ لیکن فاطمہ خاموش رہی۔ اس کے بعد گویا پلا جانکا ختم ہو گیا۔ وہ تم سے خالق نہ رہی اور ہم یہ بھول گئے کہ ہم دراصل اسے پاس کرنے آئے ہیں۔ فاطمہ تو شاید اسی نفع رخصت ہو جاتی لیکن ہوا یہ کہ فرخ بیمار نو شنگی کی وجہ سے بربی طرح پچھیش کے مرض میں متلاہ ہو گیا۔ اب ہمیں مجبوراً یہاں قیام کرنا پڑا۔ وہ ہنس کر کبھی شرست لاتی کسی بھی چالئے۔ باقیں اس قدر تیزی سے، اتنی انگلت کرتی کہ دینی ببل بھی گھبرا جائے۔ ایک روز کچھ کاڑھے ہمئے میر پوش ادا کر گئے ہمارے کمرے میں لائی اور فرخ سے بولی:

"بھائی جان پلیز! اج جب امی آپ کو میرے یہ کپڑے دکھائیں تو میری تعریف کر دیجئے گا۔

آج ان کا یہ پلان ہے۔"

"کچھ پیسے لگیں گے" فرخ بولا۔

"میں دیوول گی آپکو۔ پلیز:

"تعریف کیوں کرنی ہے۔" میں نے پوچھا۔

امی کہیں گی یہ میں نے کاڑھے ہوئے ہیں۔ وہ آپ پر اچھا اپر لشکن ڈالنا چاہتی ہیں۔ پلیز جی۔ آپ بھی تعریف کر دینا۔ اپنے سکریٹ نہ پیتے رہنا روز کی طرح ——" وہ میری طرف دکھئے بغیر

نمایا طب ہوئی۔

فاطمہ نے اسے لکھیں سے دیکھا تو وہ چپ چاپ پڑے اٹھا کر لے گئی۔  
سلیمان جسے فرج اب پیار سے لمحہ باندھ ری کئے تھا، تم دونوں سے ایسے گھل مل گئی تھی جیسے ہماری  
چھوٹی بہن ہو۔ پہلے نہ سے تھی تھا، پھر مزدوج تھی۔ نہ مئے میں مر گئی۔ امی جان سے ار دیں گے۔  
مجھے تو آپ کے ساتھ تھیں کہ رہنا چاہئے؟

یہ ہماری رخصت سے ایک دن پہلے کا واقعہ ہے۔ فرج سلیمان کے حق میں بیک پڑھا تھا۔ میں جو  
عشتی کے میدان کا بڑا جو دھاتا، اب جو کو جو کہا کہ ار قدم دھرم رہا تھا۔ فلامل خناب لگی تائیک کی طرح بیک دم  
شی سے مس زہرنے والی مشکل لئے پھر قی رہی۔  
میں سلیمان کے عشتی میں گرفتار نہ ہوا تھا۔

مجھ پریا سے گھوڑے کو تو خود بچکا رکھ کر فاٹلہ کھیل لے آئی تھی۔ پہلے فاطمہ نے بیاس کا  
احساس دلایا۔ پھر فرج نے اور کھلے لیفے سا سنا کہ بھڑک کی لگا دی۔ اور پر سے سلیمان سے پہلا چھڑا اُن مشکل  
ہو گیا۔

رخصت سے پہلی شام کا واقعہ ہے۔ سلیمان اپنی آٹو گراف لے کر آئی۔ میں اس وقت قبسمتی سے  
لان میں بیٹھا تھا۔

اپنی آٹو گراف میری ناک کے مامنے کھول کر بولی۔ مسان گردیں جی اپنا۔ اگر کسی شاعر کا شعر یا  
ہوتا وہ بھی نکھو دیں۔

میر ہے آٹو گراف کے کیا کریں گی آپ؟

جب میرا شوہر بلا وجہ ڈانٹا کرے گا تو میں اسے دکھایا کر دوں گی۔

لیعنی۔؟

یہ ثبوت ہو گا کہ اُس سے پہلے بھی لوگ مجھے پوچھتے رہے ہیں۔ کوئی ذہنی اکیلا میرا دعویدا  
نہیں ہے۔

میں ہنس دیا۔ آٹو گراف پکڑی اور یہ شعر قم کر دیا:  
 دکھانی دور سے دیتے ہیں جان فر چشمے  
 قریب جاؤ تو موت سراب ملتا ہے  
 اس نے کھٹ سے یہ صندوق آٹو گراف بک میں سے پکڑ کر پینک دیا:  
 ہلے کوئی روپا ناک سا شر لکھیں — شلاً  
 نہی ہو محبوب مر سے میں کیوں نہ تمیں پیار کروں

کبھی بیوت کے طور پر دکھانی پڑتا ہے۔

اس وقت جبکہ آٹو گراف کا گلبی مغلی کا فذ، جس کی ساری گوٹ سنہ تھی، ہری گھاس پر پڑا تھا۔ فاطمہ اگئی۔ اس نے کاغذ اٹھایا، پڑھا اور خاموشی سے اسے سیمہ کو پکڑا دیا۔ سیمہ لے کے پکڑ کر تھوڑی اور خاموشی سے کھڑی رہی پھر جلدی سے بھاگ گئی۔  
 فاطمہ کرتی کی پشت پر گردن چھوڑ کر دی گئی۔

یہ کیا کھل ہے — اس نے آہستہ سے پوچھا۔

”میں بھی پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ کیا کھل ہے؟ تم مجھے تی کا پچہ بنائے گھر کیوں لئے پھر

رہی ہو؟“

”تم سیمہ سے شادی کرنا چاہتے ہو —؟“

”نہ —“ میں نے جواب دیا۔

”تمیں اس سے عشق ہو گیا ہے —؟“

یکدم وہ رسول کا منہ بند سفونج سے میں نے کہی قم کے قتل ایجاد رکار کئے تھے اسی کے موالکے سلفیں بھلے بھلے اور میرے آنسو نکل پڑے۔

ز جانے فاطمہ کے حضور میں نے ہمیشہ ان ہی آنسوؤل کی بیسٹ کیوں دی میں اس کے علاوہ کوئی اور تخفیف کبھی اسے نہ دے سکا۔

پہلی مرتبہ پتھر چاٹی تووار کی طرح میرا احتراف خود پر سے وجود کے پار ہو گیا۔

"تم جانتی ہو۔۔۔ میں ساری عمر تم سے عشق کرتا رہا ہوں۔۔۔"

ار د گرد کی گھاس دلخوش میں ہاگ آئی اور میرے آنسوؤں سے تزاریز ہونے لگی۔

"پھر۔۔۔ پھر میں تمبین کبھی سیکھ سے شادی نہیں کرنے دیں گی۔۔۔"

"کیوں۔۔۔؟"

"میکونہ و تم سے ایک ہی بچید مانگے گی۔۔۔"

"کیا؟۔۔۔؟"

"عشقتے!"

"اگر تم مجھے ازاں نہیں کرنا چاہتیں تو پھر یہ سارا اڑھو گہ کس لئے۔۔۔ میں تو۔۔۔ میں تو تم سے ازاں ہونے کا ارزہ مند بھی نہیں۔۔۔"

وہ ہنس دی۔۔۔ اطمینان بھری ہنسی۔

"تمبین تو اپنی من چاہی منزل مل گئی۔۔۔ پھر۔۔۔ اب تم کیا چاہتی ہو۔۔۔؟"

"کیاں گی مجھے۔۔۔ روٹی، کپڑا اور مکان!۔۔۔ کیاں گیا مجھے۔۔۔ دلچھٹی پھوٹی پیاں  
خنیس پالتی پالتی میا بوڑھی ہو جاؤں گی۔۔۔ جو میری آزادی کے پاؤں میں ہمیشہ زخمی ہیں گی۔۔۔  
تمبین ہی بہت آرزو تھی ان نغمیروں کی۔۔۔"

میکونہ میرے اندر ایک عورت رہتی تھی۔۔۔ ماں تو مجھے لوگوں نے کہہ کر بنادیا۔۔۔ جب میں رڑکی  
تھی تب ماں باپ کے گھر میں روٹی، کپڑا اور مکان میسر تھا۔۔۔ شادی ہو گئی۔۔۔ میں عورت بن گئی۔۔۔ پھر بھی  
روٹی، کپڑا اور مکان ہی مل سکا۔۔۔ خدا جانے پھوٹی نے اتنا سفر کر کر کیا۔۔۔ سکھ کے نئے کیا۔۔۔  
صرف روٹی، کپڑے اور مکان کے نئے۔۔۔؟"

"اور فرخ۔۔۔؟"

"فرخ؟۔۔۔ وہ چوراں پیشئے والا کاغذ ہے جووراں نہیں ہے۔۔۔ تھی دست کب کسی کو کچھ دے

کے ہیں — ؟

"فاطم! تم چاہتی کیا ہو؟"

"کہ تم اپنی نائپند کی شادی کرو۔"

"نائپند کی شادی؟ وہ کیسے ہوتی ہے؟"

"جس میں عشق کا امکان نہ ہو۔" اس نے آہت سے کہا۔ "میرے جیسی بانجھ بخوبی شادی۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ — تمہاری ہونے والی بیوی صرف روٹی، پکڑا، مکان — اور بچوں کے دعے پر آئے گی اور یہ دعے پر ہو جائیں گے۔ میں چاہتی ہوں — تمہاری بیوی کے نام خواب پرے ہو جائیں۔"

"اوہ میرے خواب؟ — بناؤ فاطم۔"

"تمہارے خوابوں کے پورا ہونے کا تو میں خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔"

"کیوں کیوں کیوں کیوں؟"

لہجن میری "کیوں" کا جواب دیشے بغیر اسی وہ اٹھ کر اندر جلی گئی۔ اسی شام فرخ کے پُر زور اصرار پر، میرے اور فاطم کے انکار کے باوجود میری اور سیدہ کی مٹکنی ہو گئی۔

ہماری کار نیو کمپیس کے چھپواڑ سے مانابد جیسی شافت مڑک پڑا گئی ہے۔ اسی سڑک جل کے دونوں طرف پوپلز کے بیٹھے اور چکنے پرولے درخت لگے ہیں۔

فاطم کے انکار کے باوجود میرے ہاتھ میں سیدہ سے مسحوب ہونے کی انگوٹھی ہے۔ فرخ پوری نظر سے مڑک کو دیکھ رہا ہے۔ کار کی دہلی پر اس کے باول بھرے باندہ میں۔

اسکی کا ایک پاؤں ACCELERATOR پر ہے۔ وہ جب اسے چاہے دبا کر فشار تیز کر سکتا ہے۔ مجھے یوں لگتے ہے گویا اس کا پاؤں تمہاری دونوں چھاتیوں کے درمیان عین واں پڑ رہا ہے جہاں تمہارا دل ہے۔ وہ جب چاہے ذرا سادہ کار اس کی رفتار تیز کر سکتا ہے۔

کار کی بتیاں جل اٹھی ہیں۔ درانتی کی شکل کا چاند بلکچے آتا ہے پر دنیا کے دے کھلے ہے تم  
چپ ہو اپنے شوہر کی وجہ سے امیری وجہ سے، نئے چاند کی وجہ سے۔ تم اپنے اندر کی عدالت کو چپ کر  
رہی ہو۔ تبیں خوف ہے کہ کہیں نے چاند کے حضور تم کی نئی آرزو کی مرتکب نہ ہو جاؤ۔

تماری دونوں پیشیاں پھلی سیٹ پر سورہی میں مچھوٹی بیچی کے مزیں انگوٹھا ہے جسے وہ چپڑے پر  
پرس رہی ہے۔ کاش سید مریب سے انگوٹھا، ہی ثابت ہو جائے ۔۔۔ میں سوچ رہا ہوں، سوچتا چلا

جارہا ہوں ۔۔۔

کاش دونوں جانب لگنے والے فریادی پولپر کبھی کہانی بھی سنائیں کہ اس بستی میں اس سڑک  
سے جلتے ہوئے انوں نے کسی مطمئن انسان کو بھی کبھی دیکھا تھا ۔۔۔  
جو جنسی بیٹھنے والے فرنخ کی طرح فاتح نہ ہو ۔۔۔  
اپنے باخقول مجبور اور مکوم ہو جلنے والی قاطر نہ ہو ۔۔۔  
مریق طرح مغلوب ہونے کی آرزو رکھنے والا نہ ہو ۔۔۔  
مفتدا ایک مطمئن انسان ہو!!



## مونج محیط آب میں

مینا صبح اٹھی تو سے یوں لگا جیسے کسی نے زبردستی اسے کھاری بول میں ریت فاکر پلا دی جو۔  
 ساتھ والے بستر پر سلوٹیں تھیں۔ ریحان صبح سورپے باہر نکل گیا تھا۔ اس نے گوشے کے جال والے سرہنڈ  
 دو پہنچ کے کوئی نہ دانت مان کئے پر دانت اسی طرح کر کر اب بے تھے۔ اس نے مردانے پڑے ہونے  
 لگا سے دوچار بامی پانی کے گھونٹ چڑھ لئے۔ اب بھی دانتوں میں ریت کر کر لئے کیسی آواز آری  
 تھی۔ سارا جسم کسی ایسے پہلوان کی طرح جھوٹا پڑھ کیا تھا جو اور پر تند ایک بھی دنگل میں تین چار بار  
 پچھاڑیں کھا کر گرا ہو۔ ماں تھند کرتی تو پوریں دکھنے لگتیں۔ چکول کر میٹلی دکھتی تو ہستی اور کھانی میٹنکیں  
 سی پھوٹنے لگتیں۔ گردن کی قوبی سے چوہنڈی کی گئی جو۔ جس رخ بھی موڑتی کردار دڑکی آواز لکھتی۔  
 ساتھ والی تپائی پر جگر مگر کرتے گلوبند کر شے میکہ، جھوڑا فی ہار پڑے تھے اس سامے  
 زیور کئے اسے گرمیوں کی تھی دوپر دل میں جھوڑز کے کلتے جکڑ گئے پڑے تھے۔ گلوبند کے سیٹ  
 پر کیا جھکڑا ہوا تھا۔ رافی ہار کی کڑھانی پر وہ کتنی ہالاں ہوئی تھی۔ جھوڑ میں سفید صراحی دار موئی نزگ  
 پلاتے تھے تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے چیل چھلا اٹھا تھیں — اب سارا زیر تپائی پر خوبزے  
 کے چکلوں کی طرح بے وقت پڑھتا کئی بار اس کے جی میں آئی کہ ایک ایک زیور کو سیٹلیوں میں یکر  
 ان کا مرند اباڑلے لئکن بدیوں سے عورت وہ سب کچھ نہیں کرتی اُن جواس کا بھی چاہتا رہا ہے اسی  
 لئے اس عورت نے بھی صرف بیٹھے موڑلی اور بھی ہی آہ بھر کر خاموش ہو گئی۔

سارا فصور اس کی بہنوں کا تھا۔ جب کھر میں چار بڑی بہنیں ہوں اور ایک سے ایک من پھٹ پیٹ کی بھی، دو بہن مینا۔ بیاہی جلتے اور اسے کچھ بھی علم نہ ہو۔ جب بڑی اپا یہی کے آئیں تو میں ابھی پھر ٹھی تھی۔ پر جیسا کہ رواج ہے دہن کے پاس پچھے بہت منڈلایا کرتے ہیں، مینا بھی کہیں قریب ہی تھی۔ جب بڑی اپا نے سیلیوں کو کھی کی کھی کر کے بتایا:

”شراستے تو وہ مجرم سے بھی زیادہ ہیں۔ سخنا قسم روز نلات کو میرے لئے ایک بگرا اور ایک سانچی کا پان لے کر آتے ہیں۔ پر کوئی میرے ناتھ پر تھوڑا کھتے ہیں جس سر ہلنے پر دکھ دیتے ہیں اور خود پیٹھ مونڈ کر پڑھنے لگ جلتے ہیں۔“

بڑی اپا کی سیلی نے پیلیوں میں گدگدی کر کے پوچھا — ”ماں پیٹھ مونڈ کر پڑھنے لگ جاتے ہیں۔ لتنے ہی بھولے بیکارے“

بڑی اپا نے بالوں کی پن سے ناخن کرید کر جواب دیا۔ ”خذ اقسام ذرا انکھوں جلتے تو ان کا چھرو شہماںی ہو جاتا ہے۔ یہ تو لیے ہی باقیں ہیں۔ مزدودہ کچھ نہیں ہوتے جو تم کھجھتی ہو۔ خدا اقسام اتنی محبت دیتے ہیں، اتنی محبت..... اتنی تعریف کرتے ہیں، اتنے پچھے جلتے ہیں کہ سب کچھ ہو جاتا ہے اور علم بھی نہیں ہوتا۔“

بے چاری مینا کم جز پانی کو سب کچھ کیا ہو جاتا ہے جس کا علم نہیں ہو پاتا۔ لیکن اتنا حذور طے ہو گیا کہ شوہر سانچی کے پان اور موتی کے بھرے لاتے ہیں۔ دیلے بھی مینا کے کھر میں سب تن پیٹ کا ہزا جلانے تھے۔ اچھا پہنچتا اور سیلے سے اعلیٰ بڑی کھلاتے تھے۔ یہاں رہ کر تو مینا اسی قد رکھ جو پانی تھی کہ ہر گھر میں اچھا پہنچتا اور تاریز کھلازندگی کی آدمی جنت ہے۔

رانی کی شادی ہوئی تو اور بھی خوابوں میں گرم مھاکوں پر گیا۔

رانی کو شادی کے پورے ایک ماہ بعد پہنچنے والے کے ساتھ انگلینڈ جان پڑا۔ اس دو ماہ سارا دن پاہنچ کے چکر میں ہستے تھے۔ رانی بھی پہنچنے شوہر کے ساتھ شپاپنگ کرنے بھلگا رہتی۔ کہیں آرام دہ جو تے خریدے جا رہے ہیں۔ کہیں انگلینڈ کے دوستوں کیلئے تخفیف خالص کا انتخاب ہو رہا ہے۔ کبھی گھروالوں کی فرائتوں

کی فرست بن رہی ہے۔ وقت ملاؤ فلموں پر نہیں دیکھی جا رہی ہیں کہ وہاں پاکستانی نہیں دیکھنے کو کب ملیں گی۔ رانی نے منزے تو کچھ نہ کہا پر اس کو دیکھ کر بیکن ہو جاتا تھا کہ شادی ڈیڈ لیٹر اپنی نہیں ہے، جہاں تما آر زدی ٹوٹے ہوئے ڈھیلوں کی طرح پڑی ہوں۔

آسیہ باجی کے دلیے پرہنچی تو خدا ہی خروکن تھا تھیسے باجی ہیک اپ کر رہی تھیں اور دو ماں بیان ڈرینگ ٹیبل پر بیٹھے کبھی نہیں پڑھتے تھے کبھی پ سمجھ کاڑھکنا گھول کر دیتے تھے۔ باجی کی قیعنی پر پشت کی جانب لمبی سی زپ تھی جو بھائی جان نے خود بندکی اور خدا جانے آسیہ باجی کے کان میں کیا کہا کہ وہ کان، ناک، انکھیں مرخ کے کشی پٹنگ کی طرح ڈالنے لگیں۔ آسیہ باجی کا دلماڈیے بھی میتا کو بہت پسند آیا تھا۔ ایسی ہری بھری گفتگو رہتا کہ سارے گھر والے چند پسند بننے اس کی ہر ریالی میں چونچیں مانتے پھرتے۔ کبھی دلماڈلے کر کے کھنچنی نہیں لگی کبھی آسیہ باجی اور دلماجھائی ایکدی نہیں بیٹھے۔ ایک بارات ایک جلوس ایک مشا عروہ ایک پلیٹ فارم کا منظر بتانا۔ دلماجھائی کے اپنے پرہب بیٹھے ہیں۔ شیلی و وزن کے سامنے پر ڈگرا اپر تبصرہ جاری ہے۔ دلماجھائی اور آسیہ باجی کی نظری ایکدی سرے کی طرف ہر کارے دوڑا رہی ہیں۔ جو بات باجی کو پسند آتی ہے وہ کھٹ سے دلماجھائی کو دیکھتی ہیں۔ وہاں سے جو باجی فرگ کر لے عالمہ ہو جاتی ہے۔ جلوٹ میں خوت کرے ہیں۔ بھری محل میں معاشرہ جاری ہے۔ آم کھلتے جا رہے ہیں۔ ہر دیٹھا اسی جو باجی کو متابے دلماجھائی کو پسند جاتا ہے۔ جو دیٹھا اسی جا جان کے ہاتھ میں ہوتا ہے باجی بھرستی نظر آتی ہیں۔ ہر طرف بغیر جو ہے بوسے ہی بوسے ہر طرف عشق ہی عشق ہے اور ایک مل س بھنی نظر نہیں آتا۔

جو ہی سکرستی وہ گلبابی کی شادی نے پوری کر دی۔

گلبابی تو شادی کے بعد اور جبی گلباب جیکی ہو گئی۔ خواہ راس کافوڑا گرا فر تھا۔ پہلی رات اس نے سارا وقت فلیش کسے دلمن کی تصویریں کھینچنے میں برسکی۔ کبھی بھر راتا کر کبھی میٹھے پینا کر، کبھی دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے، کبھی کھڑکی میں بھاکر تصویریں کھینچ لیں۔ شادی کو ایک نہتہ بھی نہ گزار تھا کہ گلبابی کی ایک بڑی سی تصوریں ملک کے مشورہ مالے کا مردی بن کر آگئی۔ دونوں اور پترے کے پھول کی طرح خوب خوش